A Colonial Study of the Novel "Lavakh"

ناول ''لواخ'' کا نوآبادیاتی مطالعہ

Dr.Usman Ghani*[1]
Assistant Professor, Department of Urdu Language and Literature, NUML, Islamabad
Dr.Naeem Mazhar*[2]
Associate Prof. Department of Urdu Language and Literature, NUML, Islamabad

[1] *ڈاکٹر عثمان غنی
استاد شعبۂ اردو، نمل، اسلام آباد
[2] * ڈاکٹر نعیم مظہر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد

Correspondance: hnmazhar@numl.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 12-02-2025
Accepted:20-03-2025
Online:28-03-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The novel "Lavakh" is a breath of fresh air in the contemporary literary scene, which was published in September 2023. This novel is also being discussed among the teachers and students of literary gatherings and universities; The story of the novel is based on one of the revolutionary actions that took place during the War of Independence in 1857, which is also known in history as the "Murray Rebellion of 1857". It contains a good deal of colonial context as per the period in which the story is set. Colonialism is basically a complete system under which a powerful state or nation suppresses a weak state or nation by its power and starts ruling it by force. This novel also shows the same conflict between the British and the Indians. The purpose of my article is to study "Lavakh" in colonial context, the important aspects of the novel in terms of time, locale, plot, characters and events.

KEYWORDS: Novel, Colonialism, 1857, War of Independence, Abbottabad, Indians, British, East India Company, Power, Knowledge, Occupation, Fiction

اختر رضا سلیمی کا ناول ''لواخ'' معاصر ادبی منظر نامے میں ایک بالکل تازہ ہوا ہے، جس کی اشاعت ستمبر 2023ء میں ہوئی ہے۔ یہ ناول ادبی محفلوں اور جامعات کے اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان بھی زیرِ بحث ہے؛ جس کی وجہ اس سے قبل اسی ناول نگار کے دو ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' اور ''جندر'' ہیں، جو اپنی اشاعت 2015 اور 2017 بالترتیب، سے آج تک صنفِ ناول پر ادبی گفتگو اور تنقید کا حصہ ہیں۔ بلاشبہ مذکورہ دونوں ناولوں کی کامیابی کے بعد سلیمی نے اس صنف میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ، ''لواخ'' کے ذریعے مزید ایک قدم آگے بڑھایا ہے؛ اردو فکشن خصوصاً ناول کے لیے یہ بات مستحسن ہے۔ میرے اس مقالے کا مقصد ''لواخ'' کا نوآبادیاتی تناظر میں مطالعہ ہے، جو ناول کے زمانے ،لوکیل، پلاٹ ، کردار اور واقعات کے لحاظ سے اہم پہلو ہے۔ نوآبادیاتی مطالعے کی طرف بڑھنے سے پہلے ناول کی کہانی کو اجمالاً دیکھتے ہیں۔

ناول کا ہیرو سکندر کوہِ ناڑہ (ایبٹ آباد) کی بلند ترین چوٹی پر موجود میدان میں واقع حضرت سید محمد خان کے مزار سے ملحقہ چلہ گاہ کے ایک کمرے میں لیٹا فلیش بیک کی تکنیک میں ساری کہانی بیان کر رہا ہے۔ یہ کہانی 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران ہونے والی انقلابی کارروائیوں میں سے ایک کارروائی پر مبنی ہے؛ جس کو تاریخ میں ''1857ء کی مری بغاوت'' سے بھی جانا جاتا ہے۔ 1857ء کی اس جنگ کا آغاز تو بنگال میں دمدم اور بارک کے مقامات سے ہوا تھا مگر جلد ہی یہ جنگ ملک گیر پھیل گئی۔ 9 مئی 1857ء کو میرٹھ کی ایک رجمنٹ کے سپاہیوں کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، مگر دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کو قتل کر ڈالا اور اپنے لوگوں کو آزاد کروا کر میرٹھ پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی کا رخ کر لیا۔ اسی وجہ سے انگریز سرکار نے ملک بھر سے اپنے فوجی دہلی بلانے شروع کیے اور یہ خبر ناڑہ کے قبیلوں کو بھی پہنچ گئی۔ اس لیے ناڑہ کے مجاہدینِ آزادی نے یہ اچھا موقع جانا کہ مری چھاؤنی میں سپاہیوں کی تعداد کم ہو گی، لہٰذا ہم یہاں سے مری چھاؤنی پر قبضہ کر کے اپنے ہم وطن مجاہدین کو دہلی میں فتح کا پیغام بھیجیں گے۔ یہ انقلابی قدم بالکل صحیح طریقے سے پڑ رہا تھا مگر ایک مخبر ناظم خان کی وجہ سے ساری بازی پلٹ گئی اور چھاؤنی میں داخل ہوتے ہی ہر طرف سے گولیاں اور توپوں کے گولے برسنے لگے؛ بہت سے لوگ شہید ہو گئے، کچھ پکڑے گئے اور کچھ ارد گرد کے جنگلوں میں چھپ گئے۔ دو دن کے اندر تمام چھپے لوگوں کو بھی ڈھونڈ نکالا گیا جن میں ہیرو کا باپ ''خانی زمان خان'' اور چچا ''فقیر خان'' بھی شامل تھے۔ ہیرو کے دوسرے چچا ''آزاد خان'' بھی حملے میں شامل تھے مگر سپہ سالار بڑے بھائی خانی زمان خان کے کہنے پر انھیں برستی گولیوں اور گولوں میں سے پلٹنا پڑا اور اپنے عم زاد عبدل کو لے کر وہ مری سے ناڑہ واپس آ گئے۔ ہیرو کے والد کو گلڈنہ کے مقام پر اکیس مجاہدین کے ہمراہ توپ سے اڑا دیا گیا؛ جن میں ملوٹ ڈھونڈاں کے رہنے والے سردار باز خان کے آٹھ بیٹے بھی شامل تھے، جنھوں نے سب سے پہلے اس کارروائی کا خیال پیش کیا تھا۔ چچا فقیر خان کو پنڈی جیل میں بھیج دیا گیا۔ توپ سے اڑائے جانے کے تیسرے روز گوروں نے اسی بستی ناڑہ پر حملہ کر دیا، ہیرو کو یہاں سے بھگا دیا گیا اور چچا آزاد خان اس سانحے میں کام آ گئے۔

ہیر و کو چچا نے کہہ دیا تھا کہ غلام خان ترین کے ہاں (ہزارہ) میں چلے جاؤ اور اسے میرا اسلام بھی کہنا۔ کیوں کہ ان قبیلوں کے آپس میں پہلے سے تعلقات موجود تھے اور ہیر و پہلے بھی وہاں ایک دفعہ ہو آیا تھا۔ یہاں ہیر و گیارہ سال رہا اور گیارہ سال بعد اسے غلام خان ترین نے ہی بتایا کہ حملے کی مخبری ناظم خان نامی شخص نے کی تھی جو لیڈی لارنس کا ذاتی ملازم تھا۔ ہیر و پہلے ہی سے اس بستی کو جانتا تھا جو کوہِ دناہ کے دامن میں تھی، اور مخبر کو یہاں ہی صلے کی زمین عطا کی گئی تھی۔ اسی رات ہیر و ناظم خان کی موت بن کر کوہ دناہ کے دامن میں موجود بستی میں آ گیا اور اڑتالیسویں دن مخبر کو اسی کی سرکار کی طرف سے دی گئی اعزازی شمشیر کے ساتھ قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہیر و یہاں سے بھاگ گیا اور نیلاں بھوتو پہنچ گیا؛ طبیعت ناساز ہو چکی تھی اور یہیں ندی کنارے ایک مزار کے احاطے میں آ گرا۔ یہیں ملنگوں نے اس کا خیال رکھا اور کئی ماہ و سال یہیں گزارے (مصنف نے تعداد نہیں لکھی)۔ سالانہ عرس پر ایک ڈالی بری امام سے آئی اور واپسی پر انھی کے ساتھ نور پور شاہاں، بری امام کے دربار پر آ گیا اور اٹھائیس سال یہیں گزارے۔

پھر یہاں سے ہیر واپنی بستی کو دیکھنے کے ارادے سے وہاں جاتا ہے اور وہیں بستی میں مستقل رہ جاتا ہے؛ حالاں کہ اس کا وہاں رہنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ان کا ڈیرہ پولیس تھانہ بن چکا تھا اور ساتھ ہی ایک دربار ''مرکزِ تجلیات؛ مردِ مجاہد، شہید بالا کوٹ حضرت سید محمد خان قادری رحمتہ اللہ علیہ'' تھا۔ یہ ہیر و کے دادا تھے جن کو حالات اور زمانے کی گردش نے آج ایک بہت پہنچا ہوا بزرگ بنا دیا تھا اور ان کے دربار پر تینوں وقت لنگر اور چلہ گاہ میں درجن بھر کمرے بھی تھے، جہاں دور دراز کے لوگ اکثر آ کر سکونت اختیار کرتے تھے۔ یہاں کے مجاور نے ہیر و سکندر کو پہچان لیا اور بتایا کہ میں تمھارا عبدل چچا ہوں اور میں نے ہی اسے دربار مشہور کروایا ہے اور لوگوں کو بتایا ہے کہ یہ کتنے بڑے بزرگ ہیں۔ اب ہیر و یہیں رہتا ہے اور اسی مزار کے چلہ گاہ میں موجود یہ کہانی سنا رہا ہے۔ پولیس اب بھی چھاپے وغیرہ مارتی رہتی ہے اور سب کو اٹھا کر لے جاتی ہے مگر سکندر کو نہیں پکڑتی کہ اسے پاگل اور مجذوب سمجھ کر چھوڑ دیتی ہے۔ ہیر و نے اپنے حلیے کے ساتھ ساتھ نام بھی بدل لیا ہے؛ کچھ عرصہ پہلے جب یہاں مردم شماری والے آئے تو اس نے نام، قوم اور پیشہ یوں لکھوایا: مستانہ خان ولد منگتا خان، قوم فقیر اور پیشہ گداگر۔

ناول کا نام ''لواخ'' پُر مغز معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے اچھا نام اس کہانی کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ لواخ پہاڑی علاقوں میں جنگی صورتِ حال کو سمجھنے میں کنائے، اشارے اور رابطے کا کام کرتا ہے۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بلند ہوتا الاؤ ہے جو دور دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لواخ کو جنگ کی صورتِ حال، وقت اور حکمتِ عملی کے مطابق مختلف معنی دیے جا سکتے ہیں اور دیے جاتے رہے ہیں۔ اس ناول میں بھی تین معانی دیے گئے ہیں، پہلا: حملہ ہو گیا ہے۔ دوسرا: بستی خالی کر دو۔ تیسرا: فتح ہو چکی ہے۔ تیسرے معنی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہیر و کے والد نے اس کی ذمہ داری لگائی تھی کہ فتح کا پیغام ملتے ہی تم خود اپنے ہاتھوں سے لواخ روشن کرنا، مگر ایسا نہ ہو سکا اور مری حملے کی بغاوت ناکام ہو گئی۔ اسی لیے جنگِ ناڑہ کے بعد سینتالیس سال سے بجھا ہوا لواخ ہیر و نے دوبارہ روشن کیا اور اب کی بار اس کے کوئی معنی نہیں تھے اور اس کا بلاوجہ جلنا ہی اس کا نیا معنی تھا۔

کہانی کا اجمالی خاکہ پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں نو آبادیاتی حالات کا اچھا خاصا مواد موجود ہے۔اس لیے نو آبادیاتی مطالعے سے پہلے نو آبادیات کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔

نو آبادیات بنیادی طور پر ایک مکمل نظام ہے جس کے تحت ایک طاقتور ریاست یا قوم کسی کمزور ریاست یا قوم کو اپنے زور سے دبا لیتی ہے اور اس پر زبردستی حکومت کرنے لگتی ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو طبقات اسی وقت پیدا ہو جاتے ہیں؛ فاتح اور مفتوح۔فاتح اور غالب ہمیشہ نو آبادکار ہوتے ہیں اور مفتوح و مغلوب نو آبادی۔نو آبادیاتی مطالعات فقط تاریخ کے چند سالوں کا مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ رفتہ رفتہ سرایت کر جانے والے ایک نظام کا مطالعہ ہوتا ہے جس میں مفتوحہ قوم خود بھی شامل ہو جاتی ہے اور اسے اندازہ تک نہیں ہوتا، جس کے اثرات ہمیشہ اس قوم میں موجود رہتے ہیں اگرچہ فاتح قوم وہاں سے چلی بھی جائے۔جب کوئی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ سیاسی، علمی، مذہبی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی قدریں بھی قائم کرتا ہے، یعنی نو آبادکار جب اپنی اقدار کا احیا کرنا چاہتا ہے تو لا محالہ اسے نو آبادیوں کی اقدار کو کچلنا یا بدلنا پڑے گا اور وہ ایسا کرتا بھی ہے؛ ایسا کرنے کے آغاز سے ہی نو آبادکاروں اور نو آبادیوں میں موجود عوام و خواص میں چند دھڑے بن جاتے ہیں۔نو آبادکاروں میں دو دھڑے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں جن میں اول تو اپنی اقدار کو تھوپنے کے لیے جبر کا راستہ اپناتا ہے اور کسی بھی قیمت پر اپنی افضلیت مفتوحہ قوم پر ثابت کرنا چاہتا ہے، مگر دوسرا دھڑا بہترین حکمتِ عملی اپناتا ہے کہ وہ مقامی زبان، تہذیب و ثقافت اور قدرے علوم بھی سیکھتا ہے اور نو آبادیوں کے رہن سہن کو جان کر اس کی جڑوں کو کاٹتا ہے۔اسی طرح مفتوحہ قوم میں کئی دھڑے بن جاتے ہیں جن میں؛ پہلا طبقہ دلچسپی کا حامل ہوتا ہے کہ جو نو آبادکاروں کی زبان، تہذیب و ثقافت اور علوم سے تو واقفیت نہیں رکھتا مگر ان کا شدید حامی ہوتا ہے اور وہ دماغ میں بٹھا لیتا ہے کہ غالب قوم کی ہر چیز ہی افضل و برتر ہے اور وہ دل و جان سے انھیں اپنا آقا مان لیتا ہے۔دوسرا دھڑا نو آبادکاروں کو نہ صرف افضل مانتا ہے بلکہ اپنے ہی ملک میں ان کی تہذیب، زبان اور علوم کو جاننے کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور اپنی شناخت کو بھول کر مستعار تشخص کو اپنانے لگتا ہے۔تیسرا دھڑا وہ لوگ ہیں جو اپنے آقاؤں کے دیس میں جا کر ان کے علوم، تہذیب اور زبان کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک اور بھی طبقہ ہوتا ہے جو اپنوں اور غیروں سبھی کی دشنام طرازی کا سامنا کرتا ہے مگر اپنی تہذیب اور شناخت کی عظمت کو دل سے لگائے رکھتا ہے یعنی وہ لوگ جو تمام تر مشکلات کے باوجود بھی نو آبادکاروں کی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے اور انھیں رحم دل، مہذب اور جدید علوم کا ماہر ماننے کی بجائے، غاصب، قابض، استعمار اور ظالم سمجھتے ہیں۔اس نو آبادیاتی نظام کی اصل غرض و غایت کے متعلق ڈاکٹر ریاض ہمدانی اپنے ڈاکٹریٹ کے (مطبوعہ) مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''نو آبادیات ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک طاقتور ملک کمزور ریاست پر براہِ راست اپنا عسکری، سیاسی، معاشی اور ثقافتی تسلط قائم کرتا ہے۔اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو وسعت دے کر دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا جاتا ہے تاکہ مقامی آبادی کی افرادی قوت اور وسائل پر دسترس حاصل ہو۔''(1)

نوآبادیاتی تناظر میں ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر دو دنیاؤں کی تشکیل ہو جاتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد پر قائم ہوتی ہیں؛ مگر روزِ روشن کی طرح یہ بات بھی عیاں ہے کہ ہمیشہ طاقت ور کی دنیا یعنی نوآبادکار کی دنیا، کمزور یعنی نوآبادیوں کی دنیا کو کچلنے اور مسلنے پہ قادر رہی ہے۔اس مقالے کا نظری دائرہ کار بھی نوآبادیات کے کچھ ایسے ہی پہلو سامنے لانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے، جس کے بارے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی رائے دیکھیے:

> "یہ تو بجا کہ نوآبادکار کی دنیا، مقامی باشندوں کی دنیا کو خارج کرنے کے اصول پر قایم رہتی ہے۔ نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے، وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں، مگر یہ درست نہیں کہ مقامی باشندوں کی دنیا، نوآبادکار کی دنیا کے اوصاف کو خارج کرنے کا اصول قایم کرتی ہیں۔ اپنی متقابل دنیا کی اشیا اور تصورات کو خارج کرنے کے لیے اقتداری حیثیت کا مالک ہونا ضروری ہے، نوآبادیاتی دنیا اس سے بُری طرح محروم ہوتی ہے۔''(2)

یعنی نوآبادکار اپنی شخصیت، قوم اور ذات کے متعلق خاص قسم کے نظریات کا پرچار کرواتا ہے، اپنی ثقافت، علمیت، سیاسی نظریات اور فنونِ لطیفہ کے متعلق من چاہی تبدیلیاں اور بیانیے تخلیق کرواتا ہے؛ اور دوسری طرف نوآبادیات کا شکار ہونے والا دن بدن اپنی شناخت تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہی خصوصیات ایک نوآبادیاتی نظام کی ہمارے سامنے آتی ہیں۔:

- اجنبی معاشرے پر سیاسی اور قانونی تسلط
- معاشیات اور سیاسی انحصار کے تعلقات
- سامراجی طاقتوں اور کالونی کے درمیان استحصال
- نسلی اور ثقافتی عدم مساوات

مندرجہ بالا خصوصیات کے تناظر میں اس ناول ''لوخ'' کے چند نوآبادیاتی گوشے سامنے لاتے ہیں؛ نوآبادیاتی نظام کے اندر رہنے اور جینے والا کوئی بھی شخص اپنے نفسیاتی اور روحانی وجود کو بھی ہر وقت اس نظام میں پاتا ہے؛ اسی لیے کوئی شخص یا تو قوانین کو مانتا ہے یا انکار کرتا ہے۔ بلاشبہ نوآبادیاتی نظام نے بھی نوآبادیوں کے باسیوں کو ذہنی، فکری اور روحانی سطح پر مفلوج کیا اور پھر ان کا رویہ ایسا حاکمانہ ہوتا ہے کہ محکوم کو انسان ہونا ایک گھناؤنا فعل معلوم ہونے لگتا ہے۔ ناول ''لوخ'' میں ایسے کئی اشارے، واقعات، مثالیں اور کرداروں کے رویے مل جاتے ہیں جن میں نوآبادیاتی تصور کی ایسی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے صاف اور واشگاف الفاظ میں ایسے تاریخی الفاظ اور جملے رقم کیے ہیں کہ جس سے نوآبادیاتی نظام

کے کرتا دھرتا ہمیں اپنے جانوروں/کتے، بلیوں سے بھی بدتر خیال کرتے ہیں اور نہ صرف خیال کرتے ہیں بلکہ بتاتے بھی ہیں۔ نوآبادکاروں کا ماننا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو ہی قسم کے لوگ آباد ہیں؛ ایک دیسی اور دوسرے وہ خود ہیں۔ اسی لیے وہ کسی بھی قسم کی ذات، نسل یا مذہب سے تعلق رکھنے والے سے غلاموں اور محکوموں والا ہی سلوک کرتے ہیں اور اپنی عمارتوں کے دروازوں پر انھوں نے جلی حروف میں لکھوا رکھا ہے:

"یہاں دیسیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ حالاں کہ میں نے سنا ہے کہ
کتے رات کو، ان کی بیویوں کے ہمراہ، ان کے بستروں میں سوتے ہیں۔''(3)

ہیروکا بولا گیا یہ جملہ صاف بتاتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے مالک ہم سب کو ایک ہی نظر ''دیسی'' سے دیکھتے ہیں اور ہماری شناخت اپنی ذاتی شناختوں میں یوں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے کہ اجتماعی سوچ بن ہی نہیں پاتی۔ بنیادی طور پر وہ ہمیں نیچا، رذیل اور کم تر دکھانے کے لیے ہماری شناختوں کے بخیے ادھیڑتے رہتے ہیں، جس سے ہماری نفسیات پہ چوٹ پڑتی ہے اور ہم اندر ہی اندر بکھراؤ کا شکار ہونے لگتے ہیں اور دوسری طرف یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وہ ظاہری ذلالت کے لیے ہمیں کتوں سے منسوب کرتے ہیں مگر رات کو ان کی مَیمیں انھی کتوں کے ساتھ بستر سانجھا کرتی ہیں، ذرا سا سوچنے پر بھی اس نوآبادیاتی حربے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ناول نگار نے ایک اور جگہ پر نوآبادکار انگریزوں کے بارے اپنی حیثیت کی تذلیل کا اسی نوعیت میں ذکر کیا ہے کہ انگریز ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھتے ہیں اور سب کو ایک ہی ریوڑ میں ہانکتے ہیں اور ذاتی شناخت کو بالکل مسخ کر دیتے ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے عقیدوں، وفاداریوں، ذاتوں اور جغرافیائی نسبتوں سے جاننے کی بجائے اپنی ''شک کی نظر'' سے دیکھنے اور دیسی کہہ کر گھٹیا بنانے کے عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہیں سے ان میں اور ہم میں ایک بنیادی فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ افضل ہیں اور ہم کمتر ہیں۔ اس طرح نفسیات کا ایسا کھیل شروع ہوتا ہے کہ دیسی اور محکوم و غلام ہو کر بھی افضلیت کا ایک ہلکا سا شرارہ ہمیں نوآبادکاروں کی معیت اور قربت میں رہنا، ان کا منظورِ نظر ہونا، ان کی ہاں میں ہاں ملانا، دکھائی دیتا ہے۔ مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ نوآبادکار صرف وسائل کو ہڑپنے آیا ہے، ہمیں پسند کرنے نہیں۔ ناول نگار نے نوآبادکار کی اس چال کو یوں بتایا ہے:

"ان ولایتیوں کو بھی ہم دیسی لوگ، بھیڑوں کی طرح، ایک ہی
جیسے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں؛ شک
کی نظر سے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی، جو ان کے ملازم ہو کر، ان کی
وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔''(4)

نوآبادکار کا مقصد کسی بھی طرح سے نوآبادیوں سے مال، وسائل اور قیمتی اشیا کا حصول ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی ہمدردی اور رحم کے اپنے مقصد کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو مارتا ہے، زبردستی اپنی فوقیت اور برتری کا یقین دلاتا ہے اور سب سے بڑھ کر بڑے عمدہ عمدہ نعرے تخلیق کرواتا ہے؛ جس سے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کی جا سکیں اور انھیں یہ باور کروایا جا سکے کہ آپ کے لوگ تو نادان، کم عقل، جاہل اور وحشی

تھے؛ یہ تو ہم ہی ہیں جنھوں نے آ کر آپ کی جہالت ختم کرنے کی کوشش کی اور آپ کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لایا اور اب مزید لانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اس بات کا یقین ہو جانا ایک معمولی بات ہے اور لوگ اس جھانسے میں آ بھی جاتے ہیں اور اپنے غاصب کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس کی ایک نو آبادیاتی نظام کے تحت سوچی سمجھی اور منظم چال ہوتی ہے۔ طاقت کی اسی کارروائی کے متعلق ڈاکٹر ناصر عباس نیر ''نئے نقاد کے نام خطوط'' میں لکھتے ہیں:

> "جن کے پاس طاقت ہے، وہ تاثر یا اپنی آرزو کے تحت گھڑی گئی سچائی کو ایک جیتی جاگتی حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔ یاد رکھو، طاقت صرف کرسی، بندوق، دھن کی نہیں، گروہ اور تاثر کی بھی ہوتی ہے۔''(5)

طاقت اپنے نظریات خود گھڑتی ہے، نہ صرف نظریات اور نعرے گھڑتی ہے بلکہ ان نظریات کی سچائی کو تسلیم کرنے پر مصر بھی رہتی ہے۔ ان نظریات اور سچائیوں کی اشاعت نو آبادکار ہر ممکنہ صورت میں کرواتے ہیں، جن میں مذہبی اور ادبی طبقہ خصوصیت سے شامل ہوتا ہے؛ مذہب کے ساتھ لوگوں کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے اور ادب کے ساتھ لوگوں کی عقلی دل لگی۔ مذہبی لوگوں کے ذریعے مسجدوں، مندروں اور چرچوں میں اپنی مرضی کے بیانات اور تقریروں کا سہارا لیا جاتا ہے، جب کہ ادبی سطح پر مختلف مروجہ اصناف کا سہارا لے کر اپنے موقف کی سچائی کو عام کرنے اور رائج کرنے کی سعی عمل میں لائی جاتی ہے، یوں ایک بیانیہ تشکیل پاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید اپنی کتاب ''ثقافت اور سامراج'' میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "ناول اور سامراجیت ایک دوسرے کے بغیر ناقابل تصور ہیں۔ تمام نمایاں ادبی صورتوں میں سے ناول تازہ ترین ہے، اس کے ظہور کا دور درست طور پر بتایا جا سکتا ہے۔ ناول اور سامراجیت نے ایک دوسرے کو اتنا زیادہ تحفظ دیا کہ میرے خیال میں ایک کے بغیر دوسرے کا مطالعہ کرنا ناممکن ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ناول ایک بھٹی، ایک نیم انسائیکلوپیڈیائی ثقافتی صورت ہے۔ اس میں ایک نہایت منضبط پلاٹ میکنزم اور سماجی حوالے کا پورا نظام بھی ملفوف ہوتا ہے جس کا دار و مدار بورژوا معاشرے کے موجود اداروں، ان کی حاکمیت اور قوت پر ہے۔''(6)

یعنی ناول نے تو باقاعدہ طور پر سامراج اور نو آبادکاروں کو تحفظ فراہم کیا ہے اور ایسے بیانیے تشکیل دیے ہیں جن کے ذریعے سے دنیا میں ایک خاص قسم کا رجحان پیدا ہوا اور ہوتا رہا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ جس انداز سے ناول میں مکمل ایک دنیا بسائی جاتی ہے اور اس میں ثقافتی رنگوں کو اجاگر کر کے معاملے اور علاقے کی جزئیات تک جایا جاتا ہے؛ یہ کسی اور صنف کے حصے میں نہیں آیا۔ مذکورہ ناول ''لواخ'' میں بھی ایک خاص قسم کی علاقائی صورتِ حال کو بیان کرنے کے لیے جن

جزئیات اور پھر علمی کاوشوں کا استعمال اپنے بیانیے تشکیل دینے کے لیے نو آبادکار کرتے رہے ہیں اور ڈویژن ہزارہ، شہر ایبٹ آباد میں کوہِ ناڑہ کے علاقے کی جنگی، بہادری پر مبنی اور جہاد پسند تحریکوں کی عظمت کو کچلنے اور اپنے موقف کے مطابق بدلنے کی کوششیں بھی دکھائی گئی ہیں۔

ناول میں مہتاب سنگھ نامی ایک سکھ کو انگریز بہادر اس کام کے لیے مقرر کرتے ہیں اور اسے ان علاقوں کے حریت پسندوں کی تاریخ اپنی مرضی سے لکھوانے کے لیے تنخواہ پہ رکھتے ہیں۔ انگریز بہادر ایک سکھ کو اس کام کے لیے اس لیے متعین کرتے ہیں کہ اس سکھ کو اپنے سکھ بھائیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے انھیں لوگوں سے شکستِ فاش ہو چکی ہے (جسے تاریخ میں جنگِ ناڑہ کے نام سے جانا جاتا ہے) اور وہ اب سپہ گری چھوڑ کر انگریز کا ملازم ہو گیا ہے، لہٰذا یہ جانتا بھی ہے کہ اس علاقے کے لوگ بہادر، نڈر اور محافظ قسم کے ہیں مگر یہ انگریز کے مطابق ہی تاریخ لکھے گا، کیوں کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے۔ تاریخ کو اپنی مرضی سے ڈھالنا اور لوگوں کو اپنی مرضی سے تاریخ کو توڑ مروڑ کر دکھانا نو آبادکاروں کا ایک خاص حربہ رہا ہے۔ کہانی کا راوی سکندر خان اپنے باپ کے لکھے نوشتے کے ابتدائیے میں ہی بتاتا ہے کہ میرے باپ نے میرے نام سے نوشتے میں ہدایت لکھی:

> "میں چاہتا ہوں کہ تم نے جہاں اتنی کتابیں حفظ کی ہیں، وہاں اپنے باپ دادا کی تاریخ بھی حفظ کر لو کہ اب ہمارا نیا دشمن، جو سمندر پار سے آیا ہے، اپنی مرضی سے اس علاقے کی تاریخ لکھوا رہا ہے، جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اس کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا سکے جو یہاں کے لوگوں نے میدانِ جنگ میں اپنے خون سے لکھی ہے۔''(7)

اپنے بیٹے کو نوشتے کو حفظ کرنے اور تاریخ کو اصل حقائق کے ساتھ جاننے اور یاد رکھنے کی ہدایت کے بعد آگے چل کر یہاں کے باشندے یعنی مہتاب سنگھ سے اپنا مکالمہ بھی لکھتے ہیں، جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نو آبادیات کے اثرات اتنے گھمبیر ذہنوں میں گھر کر جانے والے ہوتے ہیں کہ لوگ اپنے نو آبادکار کی خوشنودی اور نوکری کے حصول کے لیے اپنے ہی لوگوں کے خلاف اور اپنی ہی تاریخ کو الٹ پلٹ کر کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ ایک پیرا دیکھیے:

> "انھی کاغذوں میں سے ایک اور کاغذ پر، ایک ایسے واقعے کو توڑ مروڑ کر لکھا گیا تھا، جس کا میں (راوی کا والد) چشم دید گواہ تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں، یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا تھا، تو کہنے لگا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں (مہتاب سنگھ) خود بھی اس جنگ میں شریک تھا لیکن میری مجبوری ہے کہ میں پورا سچ نہیں لکھ سکتا ورنہ صاحب بہادر کی خوشنودی حاصل نہیں کر پاؤں گا۔ انھوں نے مجھے ہدایت دی ہے کہ وہ قبائل جنھوں نے سب سے آخر میں ہتھیار ڈالے، ان کے واقعات میں

تھوڑا ردوبدل کر دو اور ان لوگوں کے حالات و واقعات کو مبالغے سے بیان
کرو جنھوں نے شروع ہی سے ہمارا ساتھ دیا ہے۔''(8)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناول نگار نے کس خوبی سے نوآبادکاروں کے اس منظم حربے کو بے نقاب کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس علاقے (ناڑہ) کے لوگوں نے انگریز بہادر کی ہر چال کے بدلے اپنی تدبیر بھی عمل میں لائی اور یوں نوآبادیات کا دائرہ مکمل ہوتا دکھائی دیتا ہے؛ کہ اگر انھوں نے اپنی مرضی سے تاریخ لکھوانے کا بندوبست کیا تو ہیرو کے والد نے اپنی اصل تاریخ بھی لکھنی شروع کر دی۔ مہتاب سنگھ کی لکھی تاریخ بھی بعد میں شائع ہوئی اور ادبی و مجالسی مقامات پر رکھوائی گئی؛ کیوں کہ ناول نگار نے آخر پہ بتایا کہ میں نے مہتاب سنگھ کی غلط تاریخ کو بھی اپنے دادا کے مزار والی لائبریری میں دیکھا۔

نوآبادکاروں کا تاثر نوآبادیوں پر اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ مقامی لوگ، اپنے ہم وطنوں سے زیادہ انھیں اپنا ہمدرد، مسیحا اور بہتر سمجھنے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ ان کے دماغوں اور سوچوں پر بھی یہ خیال غالب آجاتا ہے کہ انگریز (نوآبادکار) ہم سے زیادہ پڑھا لکھا، نرم مزاج اور سمجھدار ہے۔ یعنی مقامی لوگوں کو اس بات کا یقین کروا دیا جاتا ہے کہ تم اور تمھارے لوگ ہر معاملے میں اجڈ، جاہل، نکمے اور بد تمیز قسم کے انسان ہیں۔ نوآبادکار اس معاملے میں مسکین اور کمزور لوگوں سے اپنے مطلب کی براری کے لیے ان سے ظاہراً ایسا کرتے بھی ہیں، جن کے پیچھے نوآبادکار کے مذموم ارادے مضمر ہوتے ہیں۔ ناول ''لواخ'' میں بھی کئی جگہوں پر اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مقامی نوآبادیات میں جکڑے ذہن اس بات کا اقرار اور اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

گورے کی سخاوت اور بہتر برتاؤ پر ناول کا راوی سکندر کہتا ہے کہ جیل کے اندر بھی وہ قیدیوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں، مگر ہمارے اپنے لوگ باہر بھی بھوکے کو نہیں پوچھتے اور جیلر جو عموماً مقامی ہی ہوتا ہے، ہم قیدیوں کو تو مار مار کے نڈھال کر دیتا ہے؛ مگر گورا ایسا نہیں کرتا، بلکہ ہمارا خیال اچھے سے رکھتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"دورانِ تفتیش (جیل میں) بیشتر لوگ اس جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں، جو انھوں نے نہیں کیا ہوتا؛ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کئی کئی گھنٹے تھانے کی چھت سے الٹا لٹکے رہنے، چوتڑوں پر ڈنڈے کھانے اور نازک حصوں پر تشدد سہنے سے، جس سے وہ اپنی مردانگی تک سے ہاتھ دھو سکتے ہیں، کہیں بہتر ہے کہ سال چھ مہینے کے لیے جیل کی ہوا کھالی جائے، دال روٹی تو وہاں بھی ملتی رہے گی کہ گورا اس معاملے میں بہت سخی ہے اور باہر بے شک سارا ملک بھوکا مر جائے، جیل میں کوئی بھوک سے نہیں مرتا۔''(9)

اس کے علاوہ گوروں کے اچھے سلوک اور رویے پر دربار کا مجاور عبدل بھی اپنی بپتا سناتا ہوا کہتا ہے:

"گورے خود بھی بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ تمیز سے بات کرتے ہیں لیکن ان کے یہ سانولے ملازم، بہت حرامی ہوتے ہیں۔ اس کے

بقول؛میرا جن گوروں سے پالا پڑا ہے انھوں نے ہمیشہ مجھ سے اچھے لہجے میں
بات کی، یہاں تک کہ اس جج نے بھی، جس نے مجھے سزا سنائی
تھی،۔۔۔۔۔اس نے مجھے ذرا بھی نہیں دھمکایا، جیسے یہ ہمارے ہم شکل
لوگ، جو ان کے ملازم ہیں، ہر شخص کو دھمکاتے پھرتے ہیں۔''(10)

ان دو بنیادی کرداروں کے بیانات سے بات واضح ہو جاتی ہے اور قابلِ غور نکتہ بھی ہے کہ یہ دو ایسے کردار ہیں کہ جن کا سب کچھ انگریزوں کی وجہ سے ہی لٹ پٹ گیا تھا۔عبدل، خانی زمان خان کا عم زادہ بھائی تھا؛ جس نے مری بغاوت کے دوران انگریزوں کی چھاؤنی کے اندر اپنے لوگوں کو کٹتے مرتے، لہولہان ہوتے اور گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا تھا۔اس کے بعد اس نے گاؤں کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے، بکھرتے اور شعلوں میں تباہ ہوتے بھی دیکھا تھا،اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح عورتوں نے اپنے سینے پیٹ لیے تھے اور بال کھولے ماتم کرتی دہائیاں دے رہی تھیں،اس نے بچوں کی چیخیں اور لڑکیوں کی بلند ہوتی پکاریں بھی سنی تھیں،اس نے یہ بھی سنا اور لہو کے گھونٹ بھرے تھے کہ ہمارے مجاہدین اور سرداروں کو توپ کے آگے باندھ کر گولوں سے اڑا دیا گیا ہے کہ جن کو دفنانے کے لیے جسم بھی نہیں مل سکا؛ ممکن ہے انھیں غائبانہ جنازہ ہی نصیب ہوا ہو! جو اجڑا ہوا شخص اور اپنے اہل و عیال کے علاوہ اپنی دھرتی ماں کو تباہ ہوتے دیکھ کر بھی یہ کہہ رہا ہے کہ ''گورے خود بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں۔وغیرہ وغیرہ''۔اس کے علاوہ ناول کا ہیرو سکندر بھی دیکھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کی رگ رگ میں نوآبادیات کے جلوے سرایت کر چکے ہیں اور وہ بھی عبدل کی طرح بس اسی بات پر خوش اور نوآبادکاروں کی اچھائی پہ مدح سرائی کر رہا ہے کہ ''جیل میں وہ مقامی لوگوں سے زیادہ اچھا سلوک کرتے ہیں، یعنی دال روٹی تو مل جاتی ہے۔''یعنی نوآبادیاتی کردار کو اس بات سے لینا دینا ہی نہیں کہ نوآبادکاروں نے ہمارا پورا ملک ہتھیا لیا ہے، ہمیں ہر طرح سے لوٹ لیا ہے، ہم اپنے ہی گھر محلے، گاؤں، شہر اور ملک میں اجنبیوں اور غیروں کی طرح چھپتے پھرتے ہیں۔یہ دونوں کردار تو بالکل نوآبادیاتی سوچ، ثقافت اور تاثرات کو اپنے اندر پالتے ہوئے اپنی جانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔حالاں کہ دونوں کے اجداد نے سر کٹوا دیے، توپوں سے بھڑ گئے مگر نوآبادکاروں کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیے۔شاید وقت نے انھیں بتدریج غلامی کا درس سکھا دیا تھا۔اس موقعے پر اقبال کا شعر دیکھیے:

تھا جو 'ناخُوب، بتدریج وہی 'خُوب' ہُوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
(تن بہ تقدیر/ضربِ کلیم)

نوآبادکار اپنی نوآبادیوں پہ ایک اور طرح کی چھاپ بھی چھوڑتے ہیں اور وہ بڑی سخت قسم کی چھاپ ہوتی ہے، علم کی چھاپ۔یعنی نوآبادیاں یہ بالکل صحیح اور جلد مان لیتی ہیں کہ ہمارا نوآبادکار ہم سے زیادہ پڑھا لکھا اور عالم فاضل ہے۔اسی بنا پر تمام کے تمام نوآبادیوں کے باسی اپنے مالکوں اور آقاؤں کی زبان، ثقافت، ادب، فنونِ لطیفہ، لباس اور رہن سہن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔اردو ادب میں اس کی مثالیں ڈپٹی نذیر احمد، سر سید سے لے کر ''لواخ'' تک پیش کی جا سکتی ہیں۔سوال یہ

ہے کہ اگر نوآبادکار علم میں بڑے اور عالم فاضل ہوں بھی تو اس کا یہ مطلب کیسے نکل آتا ہے کہ ہماری تہذیب، علم، ثقافت اور فنونِ لطیفہ ان سے گھٹیا یا کم تر ہے؟ مگر یہ سوال سوال ہی رہتا ہے اور نوآبادیاں قابض کے طریقۂ کار کو اپنانے کی راہ پہ چل نکلتی ہیں اور بڑے بوڑھے خود اپنی رہتل کی بجائے آنے والی نسلوں کو اپنے نوآبادکاروں کے نقشِ قدم پہ چلنے کا درس دینے لگتے ہیں؛ جس سے انتشار جغرافیے سے اٹھ کر ذہنوں اور دماغوں میں پھوٹ پڑتا ہے۔ اس ایک عمل سے اپنی دھرتی، اپنے سماج اور اپنی روایت کا صدیوں کا علم، ادب اور تہذیب و ثقافت زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ ایک دم سے دو سوچیں، حامی و متخالف، پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر انھیں دو سوچوں سے ہزاروں سوچیں جنم لیتی ہیں؛ اسی لیے نوآبادیات کے اثرات کسی بھی نوآبادی کی قوم پر صدیوں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ فرانسس بیکن نے کہا تھا، "scientia potentia est" (''علم طاقت ہے)11۔ شاید اس نظریے کی ایجاد ہی نوآبادکاروں کے لیے ہوئی تھی؛ اور لطف یہ ہے کہ نوآبادکاروں نے اسے برتا بھی خوب ہے اور یہ پہلی دھونس ہے جو جبلتوں تک میں سرایت کر جاتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے مضمون ''علم اور طاقت: نوآبادیاتی سیاق میں'' میں کہتے ہیں:

> "علم طاقت ہے۔ فرانسس بیکن کے اس مقولے پر یورپ کے جدید عہد کی پر شکوہ اور ہیبت ناک عمارت استوار ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ اسی مقالے کی مشعل لے کر سمندری مہمیں طے کرتا، ایشیا و افریقا پہنچا اور یہاں کے ملکوں کو نوآبادیات کا طوق پہنانے میں کامیاب ہوا۔''(12)

اس اقتباس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ نوآبادکاروں کے حربوں اور عیاری میں علم کی طاقت اور فوقیت کو کتنا دخل ہے۔ اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو نوآبادیوں کے ہاں کسی بھی طاقت کا نظریہ عام کرنا، بالکل معمولی بات ہے۔ ناول لوخ میں بھی یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے اور وہ لوگ جو مکمل طور پر جنگجو اور اپنی دھرتی، ثقافت و تہذیب اور رہتل کے نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ کرتا دھرتا بھی ہیں، ان کے ذہنوں میں بھی یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ انگریز اس لیے ہم پہ حاکم ہیں کہ ان کی تعلیم اور علم ہم ایسے لوگوں سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے؛ بلکہ اب ہمیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی دھرتی کی اٹھان کی بجائے ان کی عطا کی ہوئی نظریاتی تعلیم اور علم کی طرف دیکھنا ہوگا۔ تلوار اگرچہ کارگر ہے مگر اب مقابلہ جسموں کی طاقت کی بجائے ذہنوں اور عقلوں کے مابین لڑا جائے گا۔ ناول کے ہیرو کا ابا خانی زمان خان بھی اپنے بیٹے سکندر کو انگریزوں کی اسی علمی برتری کے بارے میں سمجھاتا ہوا نوشتے میں بطور نصیحت چھوڑ کر جاتا ہے، الفاظ دیکھیے:

> "بیٹے! میں خوش قسمت تھا کہ مجھ سے لڑنے والے اور اس کی منصوبہ بندی کرنے والے مجھ جیسے ہی تھے اور میں ان کی ان تمام جنگی چالوں سے واقف تھا، جو وہ چل سکتے تھے لیکن تمھیں ایک ذہین اور چالاک دشمن کا سامنا ہے، جس کا دورانِ جنگ، بازوؤں سے زیادہ دماغ چلتا ہے۔''(13)

اس کے علاوہ ایک اور جگہ پر جب ہیر و مانگل شہر کے ایک عالم فاضل بزرگ سے اپنے باپ کا دیا ہوا نوشتہ وصول کرنے جاتا ہے تو وہ بھی اس کو، نئی نسل کو اسی علم کی برتری کے بارے میں سمجھاتا ہے۔ اس کی عمر اسی سال سے زیادہ ہے اور بھنویں تک سفید ہو چکی ہیں۔ اپنی عمر گزار چکنے کے باوجود اسے اس بات کا یقین آ گیا ہے کہ انگریز کا مقابلہ علم سے ہی ممکن ہے، یعنی وہ ہم سے تعلیم و علم اور تہذیب میں بہت آگے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> "اب وہی فاتح ہو گا جو صاحبِ سیف و قلم ہو گا۔'' انھوں نے تکیے کا سہارا لے کر ہلکی سی کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''سکھ انگریزوں سے اس لیے مار کھا گئے ہیں کہ ان کے پاس صرف تلوار تھی اور انگریزوں کے پاس تلوار بھی ہے اور قلم بھی۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا اب جنگ صرف بہادری سے نہیں لڑی جا سکتی؛ اس کے لیے ذہانت کی بھی ضرورت ہے اور ذہانت علم ہی سے آتی ہے۔''(14)

مہتاب سنگھ جو انگریزوں کی طرف سے تاریخ کو غلط طور پر لکھنے کے لیے معمور کیا گیا ایک ملازم ہے، مگر اسے بھی اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ انگریز اس لیے بہتر اور درست کہتے ہیں کیوں کہ ان کا علم ہم سے زیادہ ہے۔ حالاں کہ مزے کی بات یہ ہے کہ اسے ان واقعات کا پتا بھی ہے کہ وہ غلط ہیں مگر نو آبادکاروں کی علمی برتری کے بارے راسخ العقیدہ اس قدر ہے کہ پھر انھی کی بات کو افضل جانتا اور مانتا ہے کہ وہ علم والے جو ہوئے۔ جب ہیر و کے والد اور مہتاب سنگھ میں کسی واقعے پر تکرار ہوئی تو مہتاب سنگھ کی بات ملاحظہ کیجیے:

> "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حقیقت وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں؛ ہو سکتا ہے انگریز ٹھیک کہہ رہے ہوں، جو علم و فضل میں ہم سب سے بہت آگے ہیں؛ اسی علم و فضل کی بدولت انھوں نے پورا ہندوستان فتح کر لیا اور اب آپ کی ریاست بھی دو ٹکڑوں میں بٹ کر ان کو مالیہ ادا کرنے پر مجبور ہے۔''(15)

مندرجہ بالا تینوں اقتباسات بنیادی طور پر نو آبادی کے باسیوں کے الفاظ ہیں، جن میں ایک قبیلے کا سردار اور اپنی روایات کا امین ہے، دوسرا عالم فاضل اور عمر رسیدہ تجربے کار شخص ہے اور تیسرا پڑھا لکھا جنگی واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا ہے، مگر سب کے سب اس بات پر مصر ہیں کہ انگریز اپنے علم و فضل سے ہی ہم پر حاکم ہے۔ نو آبادکاروں کی بے پناہ چالوں میں ایک یہ بات بھی شامل ہے کہ محکوم لوگوں میں یہ بات کسی بھی طرح سرایت کر جائے کہ ہم افضل ہیں اور وہ اسفل و کمزور۔ چاہے پھر وہ تعلیم و علم ہو، تہذیب و ثقافت ہو یا پھر جنگی حکمتِ عملیاں ہوں یا کچھ بھی۔

ناول نگار نو آبادیاتی عہد میں نو آبادیات کے تناظرات دکھانے میں مکمل طور پر کامیاب ہوا ہے اور یہ ناول تاریخی واقعات سے جڑا بہترین نثری ادبی سرمایہ ہے۔ سب سے بڑھ کر اس ناول میں اس خطے کی تاریخ کو اجاگر کرنا ہے جس پر عموماً ادب میں کچھ خاص نہیں لکھا گیا۔ چھوٹے سے چھوٹے قبیلے نے بھی نو آبادکاروں کے خلاف اپنی سی کوششیں کی تھیں، جو کچھ عرصے

کی مزاحمت کے بعد ٹوٹ پھوٹ گئیں یا شہادتوں پہ منتج ہوئیں۔ مذکورہ ناول میں نوآبادیات سے متعلقہ کافی مواد موجود ہے جس میں سے کچھ پر بات کی گئی ہے۔ نوآبادیوں کے ذہنوں، روحوں اور جسموں پر اختیار، ظاہری و باطنی برتری کا احساس، علمی فوقیت کا یقین، طاقت کا بے دریغ استعمال، مقامی لوگوں کی کسمپرسی، جنگوں اور جھڑپوں کا احوال، سزاؤں کا نہ رکنے والا سلسلہ، اپنی دھرتی کی خاطر کٹ مرنے کا جذبہ اور شہادتیں، ثقافت کو بچانے کی کوششیں، نوآبادکاروں سے بچنے کے لیے اپنی زمینوں سے ہجرت کے واقعات، اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہونے کا خطرہ، نوآبادکاروں کے خلاف نئی نسل میں بہادری اور نفرت کا جذبہ منتقل کرنے کی کوششیں، اپنے ہی لوگوں میں اجنبی ہونے کا دھچکا اور سب سے بڑھ کر مذاہب وذاتی شناخت کو بدلنے کی سعیِ لاحاصل بھی نظر آتی ہیں۔ نوآبادکاروں کو آقا ماننا اور اپنے تشخص تک کو اس لیے مسخ کر دینا کہ بقا کا سوال ہے۔ اس تناظر میں میشل فوکو کی باتیں کتنی درست معلوم ہوتی ہیں (16)؛ جو یہ مانتا اور کہتا ہے کہ طاقت ایک لامرکز تصور ہے جو اپنی مختلف اور متنوع صورتوں میں سماجی رابطوں اور اداروں میں نفوذ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی بھی طور اس سے بچنا ناممکن ہے، چاہے یہ جسم پر طاقت ہو یا جسم کی طاقت ہو۔

حوالہ جات

1۔ ریاض ہمدانی، ڈاکٹر، اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ، لاہور: فکشن ہاؤس، 2018، ص:40

2۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی صورتِ حال، (مضمون) مشمولہ: نوآبادیات ومابعد نوآبادیات، مرتبہ: محمد عامر سہیل، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2019ء، ص:115

3۔ اختر رضا سلیمی، لواخ، راول پنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، 2023، ص:11

4۔ ایضاً، ص :11

5۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نئے نقاد کے نام خطوط، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2023ء، ص:24

6۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، مترجمہ: یاسر جواد، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2009، ص:61

7۔ اختر رضا سلیمی، لواخ، ص:37۔38

8۔ ایضاً، ص:39

9۔ ایضاً، ص:8

10۔ ایضاً، ص:9

11۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Francis_Bacon 30 نومبر، 2023، 12:44pm

12۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2013، ص:28

13۔ اختر رضا سلیمی، لواخ، ص:36

14۔ ایضاً، ص28۔29

15۔ ایضاً، ص:39

16۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، میشل فوکو کے نظریات، (مضمون) مشمولہ: مابعد جدیدیت نظری مباحث، مرتبہ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2018ء، ص:171